اقبال اور فیض: قربتیں اور فاصلے

ڈاکٹر ریاض قدیر

اقبال اور فیض کی شاعری بیسویں صدی کی دو نمایاں آوازیں ہیں۔ ان دونوں شخصیات کی ہم عصری یوں ہے کہ ایک کا سورج غروب ہو رہا تھا اور دوسرے کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ جس طرح شخصیات کی بلندیِ درجات کا تقابل ان کی فکر کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اقبال کے ساتھ فیض کا موازنہ بھی بہت سے فرق واضح کر دیتا ہے۔ اس موازنے سے محض اقبال کی فکری بلندی ہی سامنے نہیں آتی بلکہ شخصی مزاجوں کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم اس حقیقت کے باوجود یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دونوں نے فکر وفن کا کامیاب امتزاج پیش کیا ہے۔ انقلاب کو شعر و نغمہ کا آہنگ عطا کرنا بہتر انسانی معاشرے کی تعمیر کی غرض سے تھا جو دونوں شعرا کا مشترکہ وصف دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ دونوں خوابوں، آرزوؤں اور دعاؤں کے شاعر ہیں۔

اردو شاعری میں کلامِ غالب سے جس جدید طرز احساس کا آغاز ہوا، اقبال اور فیض کا کلام اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ تیز ترین سماجی تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہوئے انسانوں کے جذبات واحساسات اور عصری شعور کو غالب کے بعد اقبال اور فیض احمد فیض نے ہی تخلیقی تجربے میں ڈھالنے کے بعد منظّم فنی انداز میں پیش کیا۔ فیض صاحب نے جس دور میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا، اقبال اردو شاعری میں ایک تحریک اور روایت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ جس سے باہر نکلنا کسی بھی اردو شاعر کے بس کی بات نہ تھی۔ جوش، حفیظ اور اختر شیرانی اقبال کے اثرات کے باوجود اردو شاعری میں اپنا اپنا رنگ جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوششیں بھی دراصل اقبال کے شاعرانہ اثرات ہی کا ردِعمل تھیں۔ جب فیض کے ادبی سفر کا آغاز ہوا اس وقت اردو شاعری کی دنیا میں اقبال کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اقبال اردو شاعری کا وہ برگد تھا جس کے زیرِ سایہ کوئی شاعر قد نہ نکال سکتا تھا۔ فیض کی شاعرانہ انفرادیت اسی میں تھی کہ وہ اس برگد سے ایک فاصلے پر رہتا۔ یہ فاصلہ زمانی بھی ہے اور ذہنی بھی۔ اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) کے وقت فیض کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی اور وہ اپنے ادبی سفر کا آغاز کر چکے تھے مگر خوش قسمتی سے فیض کی شاعری کو عروج اور شہرت حاصل

کرنے کے لیے اقبال کی وفات کے بعد ایک طویل زمانی فاصلہ مل گیا تھا۔ اقبال کی زندگی میں بھی فیض اقبال کے قریب نہ آ سکے۔ اگرچہ دونوں کا تعلق ایک ہی شہر (سیالکوٹ) سے تھا اور فیض کے والد چوہدری سلطان کے ساتھ علامہ اقبال کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ اقبال کی دو تین سرسری ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ جن کا ذکر فیض نے اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے۔ بقول فیض:

ہماری طالب علمی کے آخری دن تھے۔ گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں ایک مقابلہ ہوا تھا۔ موضوع دیا گیا تھا ''اقبال'' اس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا۔ صوفی تبسم نے ہم سے کہا تم بھی نظم سنا دو تو ہم نے کہا تھا ''علامہ اقبال کے سامنے تو ہم نظم نہیں سناتے۔ صوفی صاحب نے کہا نہیں نہیں ٹھیک ہے۔ بہت اچھی نظم ہے پڑھ دو۔ چنانچہ وہ نظم ہم نے پڑھ دی۔ اس کے بعد تاثیر صاحب اور سالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔[۱]

فیض صاحب کے اندازِ گفتگو سے واضح ہے کہ یہ ملاقاتیں اتفاقی اور سرسری تھیں اور انھیں خود بقول فیض اقبال کے حضور حاضری ہی کہا جا سکتا ہے۔ فیض جاوید منزل پر ہونے والی اقبال کی محفلوں میں کبھی شعوری طور پر ذوق وشوق سے شامل نہ ہوئے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ فیض کا مزاج اقبال سے مختلف تھا اور وہ فکرِ اقبال سے ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے۔ وہ اقبال سے جذباتی طور پر متاثر نہ تھے اور نہ کبھی اقبال سے ان کا تعلق خاطر ہی پیدا ہو سکا۔ انھوں نے اقبال پر جو دو نظمیں کہی ہیں[۲] ان میں اقبال کی شخصیت کے ساتھ شاعر کی کسی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظمیں اقبال کی قومی اور شعری خدمات کو رسمی خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ فیض اقبال سے جذباتی لگاؤ نہ رکھتے تھے۔ اقبال اور فیض کی شاعری میں بعض اتفاقی اور شعوری مماثلتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اقبال اور فیض دونوں اپنی شاعری کے ابتدائی ادوار میں رومانویت کے اسیر ہیں۔ اردو میں رومانوی تحریک کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اس تحریک کے پیچھے کارفرما دیگر محرکات کے علاوہ ایک اہم محرک یہ تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان کے سکولوں اور کالجوں کے نصابات میں انگریزی رومانوی شعرا کی نظمیں خاص طور پر شامل ہوتی تھیں۔ انگریزی کے اِن رومانوی شعرا کی شاعری کی طلسمی فضا نے برصغیر پاک و ہند کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اقبال اور فیض اسی نظامِ تعلیم کے پروردہ تھے۔ اقبال کی ابتدائی شاعری میں رومانویت کی شدت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو ایک طرف اقبال کی طبع زاد نظموں میں انسانی حسن اور حسنِ فطرت سے لگاؤ، انتظار اور تنہائی کی کیفیات اور جذبہ و تخیل کی فراوانی کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں تو دوسری طرف رومانوی انگریزی شعرا کے منظوم اردو

تراجم کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

ہمالہ، ایک آرزو، شمع و پروانہ، پرندے کی فریاد، پیامِ صبح (ترجمہ لانگ فیلو)، عشق اور موت (ماخوذ از ٹینی سن)، رخصت اے بزم جہاں (ماخوذ از ایمرسن)، موجِ دریا، چاند، صبح کا ستارہ اور حقیقت حسن، جیسی نظموں پر رومانویت کی چھاپ نہایت گہری ہے۔ رومانویت کے یہ اثرات فیض کی نقش فریادی کے ابتدائی حصے کی نظموں پر بھی بہت واضح ہیں۔ آخری خط، تنہائی، مری جاں اب بھی، حسینۂ خیال سے (براؤ ننگ)، سرود، ایک رہگزر پر، یاس، تہِ نجوم، حسن اور موت، ایک منظر اور مرے ندیم، رومانوی فضا میں ڈوبی ہوئی نظمیں ہیں۔

اقبال اور فیض کے تخلیقی سفر میں ایک عجیب مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں شعرا کی شاعری کا آغاز رومانوی رجحانات کے زیر اثر ہوا لیکن دونوں شعرا نے اپنے شاعرانہ سفر کی ابتدا کے چند برس بعد رومانویت سے شعوری انحراف کرتے ہوئے اپنے فن شعر گوئی کو مخصوص نظریات سے وابستہ کرنے کا اعلان کیا۔ اقبال کی شعر گوئی کا آغاز ۱۸۹۹ء میں ہوا اور انھوں نے اپنے فنی سفر کے آٹھویں برس مارچ ۱۹۰۷ء میں ملت اسلامیہ کی حالتِ زار کا احساس کرتے ہوئے اپنے نئے ادبی نصب العین کا اعلان کر دیا کہ:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا[۳]

اسی طرح فیض کو بھی اپنی شعر گوئی کے آغاز کے چند برس بعد ۱۹۳۶ء میں معاشرے کے مفلوک الحال غریبوں کا درد ستانے لگا اور انھوں نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام نقش فریادی کے وسط تک جاتے جاتے

دلے　بفروختم　و　جانے　خریدم[۴]

کا نعرہ بلند کر دیا۔ غمِ روزگار کی شدت نے انھیں محبوب کی یاد سے بیگانہ کر دیا۔ محبوب سے معذرت کر لی اور غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف چلے آئے۔ اقبال اور فیض دونوں نے شاعری میں شعوری طور پر مقصدیت کو اپنایا۔ ایک نے مفلوک الحال ملت اسلامیہ کی المناکیوں کا مداوا کرنا چاہا اور دوسرے نے غربت و افلاس کے مارے محروم انسانوں کے دکھوں کی دوا کرنا چاہی۔ مقصدیت دونوں کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ دونوں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے راستے پر گامزن ہیں اور دونوں کے فکر و فن میں کامیاب تخلیقی امتزاج پایا جاتا ہے۔ اقبال اور فیض دونوں مثالی معاشرے کا آدرش رکھتے ہیں۔ بہتر زمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے کی صورت میں اور دوسرا غیر طبقاتی معاشرے کی صورت میں۔ دونوں اپنے آدرش کے حصول کی شدید آرزو رکھتے ہیں۔ دونوں جذبۂ شوق اور تڑپ سے سرشار ہیں:

اقبال کہتے ہیں:

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بے تاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے[۵]

فیض کا کہنا ہے:

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتش پیکار سے سینہ اپنا[۶]

دونوں کی شاعری عزم و یقین اور حوصلہ مندی کی پیغام بر ہے۔

اقبال: غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں[۷]

فیض: اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے[۸]

دونوں حصولِ منزل کے لیے عمل اور جدوجہد پر اکساتے ہیں۔

اقبال: عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے[۹]

فیض: کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو، کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے[۱۰]

دونوں کا لہجہ رجائی ہے۔ دونوں کی شاعری اندھیروں میں امید کی روشنی دکھاتی ہے اور روشن مستقبل کی نوید دیتی ہے۔

اقبال: شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے[۱۱]

فیض: دل نہ امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے[۱۲]

یہاں طوالت سے بچنے کے لیے اقبال اور فیض کے کلام سے ایک ایک شعر کی مثال دی گئی ہے ورنہ

دونوں شعرا کا کلام ایسے مضامین کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔

فیض اقبال کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ انھوں نے اردو شاعری میں حکمت اور مقصدیت کو پروان چڑھایا اور شاعری کو ذاتی اور تفریحی سطح سے اُٹھا کر اجتماعی مقاصد کا ترجمان بنایا۔ فیض اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال نے فکر و فن کے امتزاج سے اردو شعر و ادب کے لیے ایک نئے مقام کا تعین کیا۔ بقول فیض:

> آفاقی طریقہ سے سوچنے کا ڈھب، اور اس کو سوچنے کی ترغیب ہمارے ہاں اقبال نے پیدا کی اور آخری چیز جو میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے تخلیق کی وہ شعر و ادب کے لیے ایک نئے مقام کا تعین تھا۔ یہ مقام اس سے پہلے ہمارے ہاں نہ شعر کو حاصل تھا نہ ادب کو۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے شعر یا تو تفریحی چیز سمجھی جاتی تھی یا ایک غنائیہ سی چیز سمجھی جاتی تھی یا زیادہ سے زیادہ محض ایک اصلاحی چیز سمجھی جاتی تھی یہ بھی حالی کے بعد۔
> شعر میں فکر اور شعر میں حکمت اور شعر میں وہ عظمتیں جن کو ہم شاعروں سے نہیں فلاسفروں سے متعلق کرتے ہیں وہ محض اقبال کی وجہ سے ہمارے یہاں پیدا ہوئی ہیں۔[۱۳]

فیض نے اقبال کے قائم کردہ اس نئے مقام کو اپنایا اور فنِ شعر کو ایک فکر اور مقصد کے لیے وقف کیا اور اپنے مقصد کو شعر میں فنی کامیابی کے ساتھ آمیخت کیا۔ اقبال اور فیض دونوں کے ہاں شعر میں فکر و فن کا امتزاج کامیاب ہے۔ مگر دونوں کے نظریات اور مقاصد حیات میں خاصا بُعد ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد تعمیر و تکمیل خود کے ذریعے تسخیر کائنات اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ جب کہ فیض کی شاعری سے جو مقصد حیات سامنے آتا ہے وہ استحصال اور ظلم و ستم سے پاک انسانی معاشرے کا قیام ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کی مقصدیت میں حیات انسانی کی جامعیت اور وسعت ہے جب کہ فیض کی مقصدیت انسانی زندگی کے صرف مادی و معاشی پہلو تک محدود ہے۔ اقبال کا مردِ مومن جملہ جسمانی اور روحانی اوصاف سے متصف ہو کر کارزارِ حیات میں ارفع مقاصد کے حصول کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ فیض کی شاعری کا انسان معاشی جبر میں گھری ہوئی ایک بے بس اور مجبور مخلوق ہے۔ اقبال کا مردِ مومن ستاروں سے آگے جہانوں میں محوِ پرواز ہے، راکبِ تقدیرِ جہاں ہے۔ وہ آفاق میں گم نہیں ہوتا بلکہ آفاق اس میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ روحانی طاقت اور باطنی توانائی سے مالا مال ہے جب کہ فیض کا انسان استحصالی معاشرے کا مظلوم انسان ہے۔ جو آرزو اور آدرش تو رکھتا ہے آزادی کی جدوجہد بھی کرتا ہے مگر اقبال کے مردِ مومن کی صلابتِ کردار سے محروم ہے۔ اور نہ تعمیرِ کردار کے ان مراحل سے ہی گزرتا دکھائی دیتا ہے جو اقبال کے مردِ مومن کا خاصا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی نظم ''طارق کی دعا'' اور فیض کی نظم ''کتے'' کا موازنہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ پہلے اقبال کی نظم پڑھیے۔

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے　　جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا   سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو   عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن   نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظِر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

کِیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا   خبر میں نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو   وہ سوز اس نے پایا انھی کے جگر میں
کُشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو   ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے   وہ بجلی کہ تھی نعرۂ 'لاتذر' میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے   نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے[۱۴]

اب اسی بحر میں فیض کی علامتی نظم ''کتے'' ملاحظہ ہو۔

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے   کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا   جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے   غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو   ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے   یہ فاقوں سے اکتا کے مرجانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے   تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں   یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے   کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے[۱۵]

اقبال کی مقصدیت ارفع اور وسیع ہے۔ اس میں ایک جامعیت اور آفاقیت ہے جب کہ فیض کی مقصدیت اقبال کے مقابلے میں محدود ہے۔ اقبال کا شعری کینوس وسعت کا حامل ہے۔ اس میں زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ آسمانی اور مابعد الطبیعیاتی حقائق (خدا، جنت، دوزخ، حور و فرشتہ اور ابلیس وغیرہ) کا ادراک و شعور کلامِ اقبال کو ایک وسیع تناظر عطا کرتا ہے۔ جب کہ فیض کی شاعری انسان کی زمینی خواہشات اور مادی آرزوؤں کے اظہار تک سمٹی ہوئی ہے۔

اقبال کی شاعری میں زندگی کی کلیت ہے جس کا ایک جزو انسان کی معاشی محرومیاں بھی ہیں۔ اقبال

نے غربت، افلاس اور استحصال جیسے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا کیونکہ یہ حیات انسانی کے اہم مسائل اور انسانیت کا بڑا المیہ ہیں۔ اقبال استحصالی معاشرے کو قبول نہیں کرتا اور مساوات اور انصاف پر مبنی معاشرے کا خواہاں ہے۔ اقبال نے متعدد اردو اور فارسی نظموں میں سرمایہ داری اور معاشی استحصال کی شدید مذمت کی ہے۔ بندہ مزدور کے تلخ احوال کی عکاسی کی ہے اور اسے بیداری اور انقلاب کا پیغام دیا ہے۔[۱۶] اقبال کے ہاں یہ مسائل زندگی کا ایک حصہ ہیں پوری زندگی نہیں جب کہ فیض انسان کے معاشی مسائل ہی کو اس کی پوری زندگی سمجھتا ہے۔ فیض کی شاعری کا جزو اعظم مادیت اور معیشت ہے جب کہ اقبال کی شاعری کا جزو اعظم مذہب ہے۔ اقبال زندگی کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جس کے مطابق زندگی دارالعمل، دارالامتحان اور انسانی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی جگہ ہے۔

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی[۱۷]

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے[۱۸]

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے[۱۹]

فیض زندگی کو گناہ کی فرصت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے[۲۰]

یہ بجا ہے کہ اقبال اور فیض دونوں نے زاہدِ تنگ نظر اور کم فہم ملا پر جا بجا طنز کیا ہے جو کسی حد تک فارسی اور اردو شاعری کی روایت کا تتبع ہے اور بڑی حد تک مذہب کے ظاہری اور جمودی پہلو پر چوٹ۔ مگر اقبال نے فی نفسہٖ مذہب کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اقبال کے ہاں مذہب انسانی قوت و عظمت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اقبال کی پوری شاعری خدا اور انسان کے روحانی تعلق کی تفسیر ہے جسے اقبال نے عشق، سوز، شوق اور آرزو و جستجو سے تعبیر کیا ہے:

تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو[۲۱]

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ 'اللہ ھو' میرے رگ و پے میں ہے[۲۲]

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی[۲۳]

فیض کی شاعری خدا اور انسان کے اُس روحانی تعلق سے عاری ہے جو اقبال کی شاعری کی کلید ہے۔ یہ تعلق معبود اور عبد کا بھی ہے اور اللہ اور خلیفۃ اللہ کا بھی۔ اقبال کا مردِ مومن اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس اور عشقِ رسول کے مراحل طے کرتا ہوا نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہے۔ اقبال انسان کے مقامِ عبودیت کو اس کی عظمت کا اصل راز قرار دیتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی[۲۴]

جب کہ فیض نے اپنی پنجابی نظم ''ربّا سچیا'' میں انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا مذاق اڑایا ہے۔

ربا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوے بندیا جگ دا شاہ ہیں تو
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نَیب تے عالیجاہ ہیں توں
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کِیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی ساروی لئی او رب سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کِیہہ کیتیاں نیں

کِتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کِتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈّاں چ کلپے جان میری
جیویں پھاہی چ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکڑ منگنا ہاں
میری منّیں تے تیریاں میں مناں
تیری سونہہ جے اک وی گلّ موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربّا
فیر میں جاواں تے رب کوئی ہور لوڑاں[۲۵]

فیض کا انسان زندگی کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا اسیر ہے۔ وہ کم حوصلہ ہے اور اپنی خواہشوں کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اپنے رب سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہے جب کہ اقبال کا انسان کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ اپنے مصائب پر شکوہ کناں تو ہوتا ہے مگر خدا سے اپنا تعلق نہیں توڑتا۔ بلکہ دعا گو رہتا ہے کہ

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے[۲۶]

اقبال مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں جب کہ فیض صاحب مذہب سے بدکتے ہیں اور اقبال کی شخصیت اور شاعری کے اس پہلو سے گریز کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے اقبال پر جو چند مختصر اور تاثراتی تحریریں لکھی ہیں۔ ان میں فکرِ اقبال کے مذہبی پہلو سے شعوری طور پر پہلو تہی کی گئی ہے۔ ان تحریروں میں فیض نے اقبال کے فن شاعری کو تو سراہا ہے مگر فکرِ اقبال کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ خصوصاً فکرِ اقبال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں اس کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے وہاں فیض اقبال کی مذہب سے وابستگی کا اعتراف تو کرتے ہیں مگر فکرِ اقبال کے مذہبی نقش کو مدھم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً ایک مضمون ''کلامِ اقبال کا فنی پہلو'' میں لکھتے ہیں:

> میں یہ وضاحت کر دوں کہ مذہب سے گہری وابستگی کے باوصف اقبال دوسری دنیا کا ذکر ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو صرف استعارے کے طور پر۔ اس کے ہاں عاقبت کا تذکرہ کہیں کہیں ملتا ہے دوسری زندگی میں انعام یا سزا کا اس کے ہاں ذکر نہیں۔[۲۷]

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شاعر مذہب سے گہری وابستگی تو رکھے مگر مذہب کے بنیادی عقیدہ (آخرت یعنی دوسری دنیا) کا ذکر نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں حیات بعد الموت (دوسری دنیا) کا ایک واضح تصور موجود ہے۔ اپنی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اقبال کہتے ہیں:

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے[۲۸]

اسی طرح اقبال کا شہرہ آفاق فارسی مجموعہ کلام جاوید نامہ دوسری دنیا میں موجود مرحوم عالمی شخصیات کی ارواح کے احوال پر مشتمل ہے۔ اور فیض صاحب کہتے ہیں کہ اقبال دوسری دنیا کا ذکر تک نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ فیض صاحب کلامِ اقبال کے ایسے مقامات سے لاشعوری طور پر دامن بچاتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۷ء میں ولادتِ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں فیض صاحب نے پیام مشرق کی منتخب نظموں کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ نظموں کا انتخاب کرتے وقت فیض صاحب نے قریباً نصف کلامِ اقبال کو ترجمے کے لیے منتخب کیا اور ''حسنِ اتفاق'' یہ ہے کہ اقبال کے وہ اشعار، نظمیں اور رباعیات ہی حذف ہوئے ہیں جن میں اقبال نے اسلامی تعلیمات، عقائد اور ملتِ اسلامیہ سے اپنی محبت و عقیدت کا والہانہ اظہار کیا ہے۔[۲۹]

فیض اقبال کی فکر کی بجائے ان کے فن سے زیادہ متاثر ہیں۔ بقول فیض:

میرے نزدیک اقبال کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر تھے۔[۳۰]

اپنے ایک انٹرویو میں فیض صاحب نے اقبال کے اسلوبِ شاعری سے اکتسابِ فیض کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں:

اقبال کے اسلوب سے میں نے بہت کچھ لینے کی کوشش کی۔ میں نے یہ اقبال سے سیکھا ہے کہ فن ریاضت چاہتا ہے۔ ریاضت کے بغیر شعر میں نغمگی، موسیقی اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال کی زندگی کے مطالعے ہی سے میں نے جانا کہ شاعری ہمہ وقتی انہماک، توجہ اور ریاضت کا تقاضا کرتی ہے۔[۳۱]

اقبال نے پرانے استعاروں اور تشبیہات کو قائم رکھا۔ صرف ان میں نئے مضامین اور نئے خیالات ڈال دیے جن سے ان کے لیے بے جان جسموں میں پھر سے خون دورہ کرنے لگا ہے۔[۳۲]

کلامِ اقبال کے بارے میں فیض صاحب کی یہ رائے خود ان کے اپنے کلام پر بھی صادق آتی ہے۔ اقبال کی طرح فیض نے بھی اردو شاعری کی مروجہ علامات کو نئے سیاسی وسماجی تناظر میں استعمال کیا اور ان علامات کو معنوی وسعت سے ہمکنار کیا۔ گل وبلبل، گلشن اور چمن کی علامتیں کلاسیکی اردو شعرا کے ہاں ایک فرد کی نفسی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ جب کہ اقبال نے ان علامتوں کو خارجی دنیا اور ملتِ اسلامیہ کے احوال کا ترجمان بنا دیا۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک[۳۳]

یہی علامتیں فیض کے ہاں وطن، اہلِ وطن اور محبِّ وطن لوگوں کے جذبات واحساسات کی ترجمان بن جاتی ہیں۔

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ فغاں ٹھہری ہے[۳۴]

بادہ و جام، مئے خانہ اور ساقی کی علامتیں کلاسیکی شاعری میں خراباتی کیفیات کے لیے مخصوص ہیں یا پھر ساقی کی علامت سے محبوب کی صفات بھی منسلک کر دی گئیں۔ لیکن مئے اور مئے خانہ اقبال کے ہاں جذبہ ایمان، روحانی قوت، عشق الٰہی اور عشق رسول کی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسی طرح ''ساقی'' کی علامت اقبال کے ہاں خدا تعالیٰ اور ساقی کوثر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی عنایات کی غمازی کرتی ہے۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی[۳۵]

ترے شیشے میں مئے باقی نہیں ہے بتا، کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے[۳۶]

فیض کے ہاں یہ علامتیں نئے سیاسی وسماجی احوال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔

ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا[۳۷]

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مئے کا، خم کا، پیمانے کا نام[۳۸]

فیض نے محتسب، قفس، صیاد اور زنداں کی علامتوں کو خاص طور پر پاکستان کے سیاسی جبر کے تناظر میں نئے معانی سے آشنا کیا۔ یہ علامتیں ان کے ہاں آمریت اور جبریت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔

چمن پہ غارتِ گل چیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے[۳۹]

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے[۴۰]

''رات'' کلاسیکی شاعری میں مصیبت اور غم کی علامت ہے۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کے عہدِ زوال کو ''رات'' سے تعبیر کیا۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی![۴۱]

فیض نے اس علامت کو مزید معنوی وسعت دی اور اسے تیسری دنیا کے مظلوم انسانوں کی محرومیوں، مصائب اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جدوجہد کی علامت بنا دیا۔ فیض کی نظم ''ملاقات'' میں یہ علامت ایک وسیع معنوی تناظر کی حامل ہے۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں
لاکھ مشعل بکف ستاروں کے
کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے میں
اپنا سب نور، رو گئے ہیں[۴۲]

فیض شعرِ اقبال کی جس دوسری فنی خوبی سے خاص طور پر متاثر ہیں وہ کلامِ اقبال کی غنائیت اور نغمگی ہے۔ اس ضمن میں فیض صاحب کا خیال ہے کہ

وہ (اقبال) لفظوں کی صوتی لہروں سے شعر میں ایسی نغمگی پیدا کر دیتے ہیں کہ کان ان کی نغمگی کو بار بار سننے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں اور زبان اُنہیں بے ساختہ دہراتی ہے۔[۴۳]

کلامِ فیض کے بغور مطالعے سے انداز ہوتا ہے کہ فیض نے کلامِ اقبال کی اس فنی خوبی کو شعوری طور پر اپنے کلام میں برتا ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اقبال کی طرح فیض صاحب کے ہاں بھی الفاظ اور حروف کی آوازوں کا گہرا شعور ملتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں جس قسم کی کیفیت یا تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں ویسی ہی آوازوں پر مشتمل الفاظ اور عروضی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو اس کیفیت سے نہ صرف ہم آہنگ ہوتی ہیں بلکہ کلام یا نظم کے تاثر کو مزید گہرا کر دیتی ہیں۔ مثلاً اقبال کی نظم ''ایک شام'' اور فیض کی نظم ''سرودِ شبانہ'' میں سکوتِ شام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دونوں نظمیں ملاحظہ ہوں۔ پہلے

اقبال کی نظم ''ایک شام'':

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش　　کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے　　نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے　　یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا　　قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا　　آغوش میں غم کو لے کے سو جا[۴۴]

اب فیض کی نظم 'سرودِ شبانہ'!

نیم شب، چاند خود فراموشی　　محفل ہست و بود ویراں ہے
پیکر التجا ہے خاموشی　　بزم انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے　　چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا　　ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر　　چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے　　کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے　　چل رہا ہے خمارِ کیف آگیں[۴۵]

ان دونوں نظموں میں س، ش، ز، خ اور ف کی صوتی تکرار خاموشی، سناٹے اور سکوت کی فضا طاری کر دیتی ہے۔ جو نظموں کے معنیاتی تاثر کو شدید تر بنا دیتی ہے۔

صوتیات کے حوالے سے اقبال اور فیض کے کلام میں ایک حیرت انگیز مشترک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ دونوں شعرا کے ہاں طویل مصوتوں (Vowels) کا چلن بہت زیادہ ہے۔ دونوں کے کلام کا صوتیاتی تجزیہ کیا جائے تو اقبال اور فیض کے ہاں فی شعر طویل مصوتوں کا تناسب بالترتیب سولہ اور پندرہ ہے۔ اس میدان میں اردو کا صرف ایک اور بڑا شاعر میر ان کے ہم پلہ ہے جس کے ہاں طویل مصوتوں کا فی شعر تناسب سولہ ہے جب کہ غالب کے ہاں یہ تناسب گیارہ مصوتے فی شعر ہے۔

مصوتے (Vowels) مصرعے میں آواز کی سمت کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مثلاً اردو کے دو طویل مصوتے ''ا'' اور ''ی'' آواز کو بالترتیب اٹھانے اور گرانے کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح اردو میں

شعری غنائیت بڑی حد تک طویل مصوتوں کی مرہونِ منت ہے۔ اقبال اور فیض کے ہاں طویل مصوتوں کی بہتات نے ان کے کلام کی نغمگی اور آہنگ میں اضافہ کیا ہے۔ ان دونوں کے کلام میں مصوتوں کے در و بست سے موسیقیت کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شعرا کا کلام موسیقاروں او رگلوکاروں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ جس سے ان دونوں شعرا کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اقبال اور فیض دونوں انقلاب کے شاعر ہیں۔ دونوں کے ہاں رجائیت ہے پھر بھی دونوں کے شاعرانہ لہجے میں ایک عمومی افتراق ہے۔ اقبال کے پیغام میں زندگی کی حرارت اور تیزی ہے جو شعلہ بن کر لپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جذبے کی شدت اور خروش نے اقبال کے لہجے کو بلند آہنگ، پرشکوہ اور پُر جوش بنا دیا ہے۔ اس میں ایک تندی اور تیزی ہے۔

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی[۴۶]

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات[۴۷]

فیض کے کلام میں زندگی کی حرارت ایک مدھم آنچ کی صورت سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا لہجہ دھیما، نرم اور قدرے سست رو ہے۔ ان کی اکثر نظمیں (خصوصاً موضوعِ سخن، ہم لوگ، صبح آزادی، نثار میں تری گلیوں کے، یاد، تنہائی، دو عشق، شام، منظر، زنداں کی ایک صبح، زنداں کی ایک شام) ان کے اسی دھیمے لہجے کی غمازی کرتی ہیں۔

اقبال اور فیض دونوں کے ہاں خطابیہ انداز ملتا ہے۔ اقبال کے خطاب میں ایک شکوہ اور شان ہے وہ ایک بلند سطح سے مخاطب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا تعالیٰ سے مخاطب ہوتے وقت بھی وہ اپنی سطح برقرار رکھتا ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کِیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا[۴۸]

اے لا اِلہ کے وارث! باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ[۴۹]

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب! لا مکاں تیرا ہے یا میرا؟[۵۰]

فیض کا اندازِ تخاطب فقیرانہ ہے۔ اس میں نرمی اور التجا ہے جو انھیں اقبال کے لہجے سے دور اور میر کے لہجے کے قریب لے جاتی ہے۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو! کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا وہ سامنے لائے دیتے ہیں[۵۱]

تم مرے پاس رہو!
میرے قاتل! مرے دلدار! مرے پاس رہو[۵۲]

اقبال اپنے پورے کلام میں خدا، انسان اور فطرت سے ایک قوتِ اعتماد اور طمطراق کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ مگر فیض کے خطابیہ انداز میں ایک آہستگی اور لہجے میں سرگوشی ہے۔ فیض کے مزاج کی دروں بینی اسے کہیں کہیں خود کلامی کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ ان کی نظم تنہائی، نثار میں تری گلیوں کے............ اس کی مثالیں ہیں۔ غزلوں کے اشعار میں بھی کئی مقامات پر وہ خود کلامی پر اُتر آتے ہیں۔

جانے کیا وضع ہے اب رسم وفا کی اے دل!
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں[۵۳]

ان سے جو کہنے گئے تھے فیض! جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد[۵۴]

اقبال اور فیض کے شاعرانہ لہجے کا فرق دراصل ان دونوں شعرا کے شخصی مزاجوں کا فرق ہے۔ اقبال کا مزاج جلال و جمال کا امتزاج ہے۔ جب کہ فیض صاحب کا مزاج جمال ہی جمال ہے۔ مزاج کے اس اختلاف کے باوجود دونوں نے فکر وفن کا کامیاب فنی امتزاج پیش کیا۔ دونوں نے انقلاب کو شعر و نغمہ میں ڈھالا۔ اقبال اور فیض کے فکری مدار اگر چہ الگ الگ ہیں مگر دونوں کی منزل بہتر انسانی معاشرے کی تعمیر ہے۔ دونوں خوابوں، آرزوؤں، اور دعاؤں کے شاعر ہیں۔ اقبال اپنے کلام میں ایک بڑا فکری وفنی دائرہ بناتا ہے۔ جب کہ فیض کا فنی دائرہ قدرے چھوٹا ہے۔ فیض کی شاعری کا چاند اقبال کی شاعری کے سورج سے ایک فاصلے پر رہ کر اپنی انفرادیت واہمیت منواتا رہے گا۔

حوالے و حواشی

۱- فیض احمد فیض، متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال لاہور، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۸۔

۲- پہلی نظم جو فروری ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کی آمد کے موقع پر پڑھی گئی، فیض کے زمانہ طالب علمی کی کاوش ہے۔ اس نظم کی فنی سطح اس قدر پست ہے کہ خود فیض نے اپنے کسی مجموعۂ کلام میں اس نظم کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری نظم اقبال کی وفات پر لکھی گئی اور فیض کے اوّلیں مجموعہ کلام نقش فریادی میں ''اقبال'' کے نام سے شامل ہے۔

۳- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۸۔

۴- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۵۹۔

۵- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۹۴۔

۶- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۴۶۔

۷- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۰۱۔

۸- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۳۸۔

۹- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۰۵۔

۱۰- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۳۸۔

۱۱- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۲۲۔

۱۲- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۷۔

۱۳- فیض احمد فیض، اقبال، (مرتب) شیما مجید، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲، ۳۳۔

۱۴- علامہ محمد اقبال، بال جبریل، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۳۲۔

۱۵- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۷۹۔

۱۶- دیکھیے اقبال کی نظمیں: خضر راہ (بانگ درا)، لینن خدا کے حضور، الارض للہ، (بال جبریل) مزدک، نوائے امروز، محاورہ مابین حکیم فرنسوی آگسٹس کومٹ و مردِ مزدور، قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور (پیام مشرق) اور ارض ملکِ خداست (جاوید نامہ)۔

۱۷- علامہ محمد اقبال، ''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۸۸۔

۱۸- ایضاً، ص ۲۸۹۔

۱۹- ایضاً، ''بال جبریل''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۷۹۔

۲۰- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۔

۲۱- علامہ محمد اقبال، ''بال جبریل''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۱۸۔

۲۲- ایضاً، ص ۴۲۲۔

۲۳- ایضاً، ص ۳۹۷۔

۲۴- ایضاً، ص ۳۵۲۔

۲۵- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۵۹۴۔
۲۶- علامہ محمد اقبال،''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)،ص۱۹۷۔
۲۷- فیض احمد فیض، اقبال، (مرتب) شیما مجید،ص۴۶۔
۲۸- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)،ص۲۶۵۔
۲۹- ملاحظہ ہو انتخاب پیام مشرق، منظوم اردو ترجمہ: فیض احمد فیض، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔
۳۰- فیض احمد فیض، اقبال، (مرتب) شیما مجید،ص۸۳۔
۳۱- ایضاً،ص۸۵۔
۳۲- ایضاً،ص۹۷۔
۳۳- علامہ محمد اقبال،''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)،ص۱۹۸۔
۳۴- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۔
۳۵- علامہ محمد اقبال،''بال جبریل''، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۵۱۔
۳۶- ایضاً،ص۳۴۶۔
۳۷- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۴۶۔
۳۸- ایضاً،ص۱۵۲۔
۳۹- ایضاً،ص۱۳۲۔
۴۰- ایضاً،ص۱۳۸۔
۴۱- علامہ محمد اقبال،''بال جبریل''، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۵۱۔
۴۲- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۲۴۸۔
۴۳- فیض احمد فیض، اقبال، (مرتب) شیما مجید،ص۸۳۔
۴۴- علامہ محمد اقبال،''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)،ص۱۵۴۔
۴۵- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۳۴۔
۴۶- علامہ محمد اقبال،''بال جبریل''، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۵۰۔
۴۷- ایضاً،ص۴۲۱۔
۴۸- ایضاً،''بانگ درا''، کلیات اقبال (اردو)،ص۲۰۷۔
۴۹- ایضاً،''بال جبریل''،ص۳۸۴۔
۵۰- ایضاً،ص۳۴۶۔
۵۱- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،ص۳۴۳۔
۵۲- ایضاً،ص۳۶۷۔
۵۳- ایضاً،ص۱۴۱۔
۵۴- ایضاً،ص۵۳۸۔